ارض القرآن کا سفر

از جناب محمد عاصم صاحب

(۸)

[اس روداد کی قسط ماہ دسمبر ۶۰ء میں "الندوہ" (مکہ معظمہ) کے نمائندۂ ریاض کے حوالے سے میں نے یہ روایت نقل کی تھی کہ ۵۸ء میں حج کے موقع پر لائل پور اور لاہور کے دو علماء نے مولانا مودودی کے خلاف اس عجیب و غریب الزام کا تایید کی تھی کہ وہ حدیث و فقہ کے منکر ہیں۔ اس پر حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کا ایک خط مدیر ترجمان القرآن کے نام موصول ہوا ہے جس میں انہوں نے اس روایت کو موضوع قرار دیا ہے اور اس کی تردید کا مطالبہ کیا ہے۔ ہمارے لیے اس سلسلہ میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ نمائندۂ الندوہ نے تین مرتبہ تباکید ہم سے یہ روایت بیان کی تھی اور ہم سے کہا تھا کہ میں نے یہ بات خود ان دونوں صاحبوں سے سنی ہے۔ حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ یہ روایت غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ سچا کون ہے اور جھوٹا کون؟ — م۔ع]

طائف کے آثار ہمارا اگلا سارا دن (۵ دسمبر) طائف کے آثار دیکھنے میں صرف ہوا۔ صبح ۹ بجے کے قریب ایک ترکستانی دوست احمد جان صاحب اپنی جیپ لے کر ہماری قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ اس میں ہم سب سے پہلے وہ راستہ دیکھنے کے لیے روانہ ہوئے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہجرتِ مدینہ سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بنو ثقیف پر اسلام کی دعوت پیش کرنے کے لیے اسی راستے سے طائف تشریف لائے تھے۔ یہ راستہ طائف سے وادی ہدا، کرا، شداد

اور عرفات سے ہوتا ہوا مکہ معظمہ جاتا ہے۔ کئی سال سے اس پر پختہ سڑک بنانے کا کام ہو رہا ہے۔ کراء طائف اور مکہ معظمہ کے تقریباً وسط میں ایک نہایت بلند پہاڑ ہے اُس وقت اس پہاڑ پر دونوں طرف سے سڑک بن چکی تھی، صرف اس پہاڑ کو کاٹ کر راستہ بنانے کا کام باقی تھا اور یہ کام بڑے زور شور سے ہو رہا تھا۔ ہم اس جگہ تک گئے، جہاں پہاڑ کو کاٹا جا رہا تھا۔ طائف سے کراء تک کافی بلند پہاڑی علاقہ ہے، لیکن کراء کے بعد یک لخت گویا میدان آجاتا ہے اور مکہ معظمہ تک زمین کی بلندی یکساں رہتی ہے۔ پہاڑ پر کھڑے ہو کر وہ سڑک بہت ہی نیچے نظر آرہی تھی جو شداد اور عرفات سے ہوتی ہوئی مکہ معظمہ کو جاتی ہے۔ لوگوں کا اندازہ تھا کہ یہ کام آئندہ چھ ماہ تک مکمل ہو جائے گا، لیکن ابھی تک اس کی خبر اخبارات میں نہیں آئی۔ یہ راستہ مکمل ہو جائے تو طائف اور مکہ معظمہ کے درمیان صرف ۶۵ کیلومیٹر (۴۰ میل کے قریب) کی مسافت رہ جائے گی، جبکہ موجودہ راستہ سے یہ مسافت ۱۲۰ کیلومیٹر (۷۵ میل کے قریب) ہے۔ طائف اب بھی بڑا اور اہم شہر ہے لیکن اس راستہ کے مکمل ہو جانے کے بعد اس کی وسعت اور اہمیت اور بھی بڑھ جائے گی۔ ایک طرف جدہ اور مکہ معظمہ سے اس کا براہِ راست تعلق قائم ہو جائے گا اور دوسری طرف نجد اور عُمان و مسقط وغیرہ کی طرف سے مکہ معظمہ آنے والوں کے لیے اس کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔ اس راستہ کے مکمل ہو جانے کے بعد سعودی حکومت کا ارادہ طائف اور ریاض کے درمیان سڑک کو بھی پختہ کر دینے کا ہے۔

طائف سے کراء اور کراء سے مکہ معظمہ، جیسا کہ ابھی عرض کر چکا ہوں، وہ راستہ ہے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم طائف تشریف لائے۔ اب بھی پیدل اور اونٹ کے ذریعے سفر کرنے والے اسی راستہ سے آتے جاتے ہیں۔ کراء پر اونٹ کے چڑھنے اور اُترنے کا راستہ بنا ہوا ہے اور غالباً عباسی دور ہی کا بنا ہوا ہے۔

کراء کے راستہ میں ایک وادی آتی ہے جسے وادی مُحرم کہتے ہیں۔ اسے وادی مُحرم

اس لیے کہتے ہیں کہ فتح طائف کے بعد مکہ معظمہ جاتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں سے عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ہیکل نے اپنی کتاب "فی منزل الوحی" میں اسی کو قرن المنازل لکھا ہے معلوم نہیں یہ کہاں تک صحیح ہے؟ اب یہاں ایک مسجد بھی بنی ہوئی ہے اور یہاں چھوٹا سا قصبہ بھی ہے۔وادی محرم کے بعد ایک دوسری وادی آتی ہے جسے وادی ہدّا کہتے ہیں۔ یہ نہایت سرسبز وادی ہے۔یہاں بھی بستی ہے اور کھیتی باڑی بھی ہوتی ہے۔واپسی میں ہم یہاں تھوڑی دیر کے لیے ٹھہرے اور ایک مدرسہ میں پانی پیا۔کہتے ہیں کہ یہاں سے بھی ایک راستہ وادی ثلیہ اور شرائع سے ہوتا ہوا مکہ معظمہ جاتا ہے اور یہ وہ راستہ ہے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہلی مرتبہ (جب کہ آپ بنو ثقیف پر دعوت حق پیش کرنے کے لیے طائف تشریف لائے تھے اور طائف کے سرداروں نے نہ صرف آپ کی دعوت قبول نہیں کی تھی بلکہ آپ کو سخت زخمی کیا تھا) طائف سے مکہ معظمہ واپس ہوئے تھے۔اب بھی پیدل یا اونٹ کے ذریعے سفر کرنے والے لوگ اسی راستہ سے سفر کرتے ہیں۔

دوپہر کے قریب ہم کراء سے طائف واپس آتے ہوتے مثناۃ گئے جو موجودہ طائف سے ڈھائی تین میل کے فاصلہ پر جنوب مغرب کی طرف ایک چھوٹی سی بستی ہے اور طائف ہی کا ایک حصہ شمار کی جاتی ہے۔یہ بستی اس جگہ واقع ہے جس کے قریب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اصل طائف آباد تھا، اس لیے ہماری دلچسپی کے آثار بھی یہیں تھے۔ایک خاص چیز جو ہم نے یہاں پہنچ کر محسوس کی، وہ یہ کہ یہاں اگرچہ اچھی خاصی آبادی ہے اور باغ، مکان اور گلیاں نہایت شاندار بنی ہوئی ہیں، لیکن یہاں کوئی آدمی ہمیں نظر نہیں آیا، گویا پوری بستی شہر خموشاں ہے۔ یہ چیز ہم ہی نے محسوس نہیں کی، بلکہ بعد میں جب میں نے ہیکل کی کتاب 'فی منزل الوحی' دیکھی تو انہوں نے بھی اس میں یہاں کی بے رونقی اور سنسان پن کا ذکر کیا ہے۔ کیا یہ ایک نبی اور وہ بھی خاتم النبیین اور سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو ٹھکرانے اور انہیں اذیت پہنچانے کی پھٹکار تو نہیں ہے؟

یہاں دو باغوں میں دو چھوٹی چھوٹی مسجدیں بنی ہوئی ہیں، جن میں سے ایک کو مسجد علی کہتے ہیں اور دوسری کو مسجد الحبشی۔ یہ دونوں بالکل غیر آباد ہیں۔ ان میں سے مسجد علی کو، جو ایک باغ کے دروازے کے ساتھ بنی ہوئی ہے، ہم نے کھولا تو محسوس ہوا کہ گویا مدتِ دراز سے نہ کسی نے اس مسجد کو کھولا ہے اور نہ یہاں جھاڑو دی ہے۔ اذان اور نماز باجماعت کا تو سوال ہی کیا؟ دوسری مسجد یعنی مسجد الحبشی ایک باغ کے اندر بنی ہوئی ہے۔ اس تک تو پہنچنا بھی آسان نہیں۔ ہم نے باغ کی دیوار پر چڑھ کر باہر ہی سے اسے دیکھا۔

ان دونوں مسجدوں میں سے ایک مسجد بہرحال اس جگہ بنائی گئی ہے جہاں زخمی ہونے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی و امی) نے آرام فرمایا اور جہاں عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ کے نصرانی غلام سیدنا عداس ؓ نے آپ کی خدمت میں انگور لا کر پیش کیے۔ لیکن یہ مسجد کونسی ہے۔ اس کے متعلق ہمارے ساتھ جو لوگ تھے، قطعی بات نہیں کہہ سکے، اور نہ خود بستی میں تلاش کے باوجود ہمیں کوئی ایسا آدمی مل سکا، جو اس بارے میں کوئی قطعی بات کہہ سکتا۔ ہیکل نے اپنی کتاب میں جس مسجد عداس کا ذکر کیا ہے، وہ غالباً مسجد علی ہی ہے۔

دونوں مسجدوں کے درمیان ایک کچا راستہ مشرق سے مغرب کو جاتا ہے، جسے وادی وج کہتے ہیں۔ یہ کافی لمبی وادی ہے۔ کہتے ہیں کہ طائف کے محاصرہ کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں صحابۂ کرام کو جمع کر کے ان کی صف بندی فرمائی تھی۔

اس کے بعد ہمارے ساتھی ثنتاۃ ہی میں ہمیں ایک اور جگہ لے گئے۔ یہاں ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی ہے جسے مسجد کوع کہتے ہیں اور اس کے ساتھ پہاڑ پر ایک بڑا پتھر اس طرح رکھا ہوا ہے گویا لٹک رہا ہے اور زمین پر پہنچنے سے صرف نصف گز کے فاصلہ پر رک گیا ہے۔ طائف کے لوگوں میں مشہور ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس پہاڑ کے دامن میں آرام فرما رہے تھے کہ اوپر سے کفار نے یہ بڑا پتھر آپ پر لڑھکا دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ سے اس کو رک جانے کا حکم دیا، تو وہ جہاں تھا، وہیں رک گیا۔ ہمیں تو یہ بات

سراسر افسانہ معلوم ہوئی۔ اس کا ذکر سیرت کی معتبر کتابوں میں نہیں ملتا۔

عصر کے بعد ہم طائف کی ایک اور مسجد دیکھنے کے لیے گئے، جسے مسجد ابن عباس کہا جاتا ہے۔ یہ ایک نہایت وسیع اور پرانی بنی ہوئی مسجد ہے۔ اس کی دائیں طرف ایک حجرے میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی قبر ہے، جس پر تالا لگا ہوا ہے اور کوئی شخص اسے جھانک کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اب اس مسجد کے ساتھ سامنے کی طرف ایک دوسری شاندار مسجد نئے طرز پر بن رہی ہے۔

مسجد ابن عباسؓ کے محلِ وقوع کو دیکھتے ہوئے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مسجد اس جگہ بنی ہوئی ہے، جہاں محاصرۂ طائف کے موقع پر مسلمانوں کا لشکر ٹھہرا تھا اور جنگ ہوئی تھی۔ اس کے بالکل سامنے جنوب مغرب میں ان صحابہ کرام کی قبریں ہیں جو غزوۂ طائف میں شہید ہوتے۔ لوگوں نے ہمیں بتایا کہ پہلے ان قبروں پر کتبے بھی لگے ہوئے تھے، لیکن اب یہ کتبے مٹا دیئے گئے۔

مسجد ابن عباس کے سامنے مغرب کی جانب تھوڑے فاصلہ پر ایک قلعہ کے آثار ہیں، جو غالباً پرانے قلعہ طائف ہی کے مقام پر ہیں۔ اگرچہ موجودہ آثار بنو ثقیف کے پرانے قلعہ کے نہیں ہیں، لیکن غالباً جگہ وہی ہے، خصوصاً جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خیمہ لگانے اور لشکرِ اسلامی کے ٹھہرنے کی جگہ اور قبورِ شہداء اس کے قریب واقع ہیں۔

مسجد ابن عباسؓ کے پاس سڑک پر پتھر کا ایک بڑا سا ٹکڑا رکھا ہوا ہے۔ جس کے متعلق طائف کے لوگوں میں مشہور ہے کہ یہ لات (وہ بت جس کی بنو ثقیف پوجا کرتے تھے اور بعد میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے اسے توڑ ڈالا تھا) کا ٹکڑا ہے، مگر اس کی کوئی سند نہیں ہے۔

مسجد ابن عباسؓ، قبورِ شہداء اور قلعہ سے فارغ ہونے کے بعد ہم لوگ ایک اور مسجد میں آئے جو طائف کے کئی بازاروں کے درمیان واقع ہے اور کافی وسیع اور پرانی بنی ہوئی ہے۔ اسے مسجد الہادی کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس جگہ پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم

نے صحابہ کرامؓ کو وعظ فرمایا تھا اور اسی لیے اس جگہ جو مسجد بعد میں بنائی گئی اُسے مسجد الہادی نام دیا گیا۔ ہم نے مغرب کی نماز اسی مسجد میں ادا کی۔

ترک حضرات کی دعوت رات کو عشاء کے بعد ترک حضرات نے ایک جگہ ہماری دعوت کا اہتمام کیا تھا جس میں ان کے اکثر بزرگ اور علماء موجود تھے۔ اس بہانے ہمیں ان کے ساتھ اطمینان سے مل بیٹھنے اور ان کے حالات سننے کا موقع ملا۔ بیچارے بڑی ہی تکلیف اور کس مپرسی کی حالت میں ہیں۔ ان کی سب سے بڑی تکلیف یہ ہے کہ اگرچہ انہیں سعودی عرب میں رہتے ہوئے ایک مدت گزر گئی ہے مگر ابھی تک انہیں تابعیہ (مستقل شہریت) نہیں دیا گیا' جس کی وجہ سے انہیں آئے دن دفتروں اور تھانوں کا چکر لگانا پڑتا ہے۔ اور ہر حال اپنی مدتِ اقامت بڑھوانے کے لیے ۴۰، ۴۲ ریال فی کس ادا کرنے پڑتے ہیں۔ جب تک تابعیہ نہ ہو وہ عرب میں کسی جگہ شادی نہیں کر سکتے، بلکہ اگر ان کا کوئی آدمی مر جائے تو عام قبرستان میں دفنانے میں بھی بڑی رکاوٹیں اور دقتیں پیش آتی ہیں۔ چینی ترکستان کے مہاجرین کو اس بات پر بھی مجبور کیا گیا کہ وہ چینی سفیر سے پاسپورٹ لیں اور پھر یہاں ویزا لے کر جب تک ویزا کی توسیع ہوتی رہے مقیم رہیں۔ مسلمان حکومتوں کے لیے مغربی تصورِ قومیت کی یہ تقلید اسلامی تصورات سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ اگر کفار کے ظلم و ستم سے تنگ آکر مسلمان اپنے دین اور آبرو کو بچانے کے لیے اپنے گھروں سے نکلنے پر مجبور ہوں تو آخر وہ مسلمان ملکوں میں پناہ نہ ڈھونڈیں تو اور کہاں ڈھونڈیں اور مسلمان ملک بھی انہیں پناہ نہ دیں تو ایمان کا رشتۂ اخوت پھر کیا معنی رکھتا ہے۔ یہ ترکستانی مہاجر درحقیقت اس زمانے کے تمام مہاجرین سے زیادہ ہمدردی اور ہر قسم کی امداد کے مستحق تھے اور لوگوں کی ہجرت میں تو کوئی دوسرا جذبہ بھی کارفرما ہو سکتا ہے لیکن ان کی ہجرت کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ انہیں اسلام ہر چیز سے زیادہ عزیز تھا اور کمیونسٹوں کے غلبہ کے بعد وہ اپنے وطن میں رہتے ہوئے اپنے دین کو محفوظ نہ رکھ سکتے تھے۔ ایسے حالات میں انہیں سب سے بڑھ کر مسلمان ملکوں میں امان ملنی چاہیے تھی لیکن افسوس

ہے کہ افغانستان، ایران، ٹرکی، عرب، کہیں بھی ان سے وہ معاملہ نہیں برتا گیا جو اسلامی برادری کے شایانِ شان ہو۔

ترک حضرات کے کھانے عربوں سے مختلف اور ہمارے ہاں سے کافی مشابہ ہیں۔ ان کے متعلق خاص طور پر قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ لوگ دن رات میں کسی وقت پینے کے لیے پانی استعمال نہیں کرتے، نہ سردیوں میں اور نہ گرمیوں میں، پینے کے لیے ہمیشہ چائے استعمال کرتے ہیں اور وہ بھی بغیر دودھ اور بغیر شکر کے۔ ہم لوگوں کے لیے شکر اور دودھ کا خاص طور پر انہوں نے اہتمام کیا تھا

طائف سے واپسی | اگلے روز (۲۶ دسمبر) صبح ۱۰ بجے کے قریب ہم طائف سے مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔ بہت سے ترک حضرات شہر سے باہر بہت دُور تک ہمیں الوداع کہنے کے لیے ساتھ آئے۔ یقیناً ان لوگوں کی محبت، اخلاص اور مہمان نوازی ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

موقع عکاظ | حوایا (طائف کا ہوائی اڈہ) کے قریب سڑک سے دائیں طرف ایک کھلی وادی نظر آئی، جس کے متعلق اکثر محققین کا خیال ہے کہ سُوق عُکاظ اس وادی میں لگا کرتا تھا۔ بعض محققین اس کا موقع سیل کبیر میں اور بعض دوسری جگہوں پر بتاتے ہیں۔

حنین | سیل کبیر پر پہنچ کر ہم نے عمرہ کا احرام باندھا اور کچھ دیر وہاں رک کر آگے روانہ ہوئے۔ طائف جاتے ہوئے ہمارا ڈرائیور بالکل جاہل تھا، اس لیے وہ راستہ کی کوئی چیز ہمیں نہ بتا سکا۔ آتے ہوئے جو ڈرائیور ملا، وہ قدرے پڑھا لکھا تھا۔ زیمہ اور شرائع کے درمیان سڑک کی دائیں طرف ایک کھلے میدان کے متعلق اس نے ہمیں بتایا کہ غزوۂ حنین یہاں واقع ہوا تھا۔ ہم نے موٹر سے اتر کر اس کی متعدد تصویریں لیں۔ افسوس یہاں بھی کوئی علامت موجود نہیں ہے۔

ظہر کے وقت ہم مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ اپنی جائے قیام پر سامان رکھ کر عمرہ کے لیے نکلے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جب اس سے فارغ ہو کر واپس قیام گاہ پر آئے تو دروازے پر

محمد عالم صاحب عطرجی کے ایک آدمی کو کھڑا پایا۔ طائف جانے سے پہلے محمد عالم صاحب سے یہ طے پایا تھا کہ ہم جس روز مکہ معظمہ واپس آئیں گے، اس روز رات کا کھانا ان کے ہاں کھائیں گے، لیکن شاید انہیں غلط فہمی ہوئی اور وہ دوپہر کے کھانے پر ہمارا انتظار کر رہے تھے اس لیے فوراً ہی کپڑے بدل کر ہمیں ان کے ہاں جانا پڑا۔

حُدَیبیہ اگلے روز (۷ دسمبر) عصر کے بعد ہم شیخ سلیمان الصنیع اور شیخ عقیل عطاس کے ساتھ مسجد حُدَیبیہ دیکھنے کے لیے روانہ ہوئے، یہ مسجد، جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، مکہ معظمہ اور جدّہ کے درمیان سڑک کے عین کنارے واقع ہے۔ مکہ معظمہ سے اس کا فاصلہ ۲۲ کیلومیٹر (تقریباً ۱۳½ میل) ہے۔ یہ مسجد اس مقام پر واقع ہے جہاں صلح حدیبیہ کے موقع پر صحابۂ کرام کا لشکر ٹھہرا تھا۔ اس کی موجودہ عمارت ۱۲۵۵ھ کی بنی ہوئی ہے۔ ۱۳۶۱ھ میں (یعنی آج سے ۱۹ سال پیشتر) اس کی مرمت ہوئی۔ اس کے اندر محراب کے پاس ایک کتبہ لگا ہوا ہے، جس پر مندرجۂ ذیل عبارت لکھی ہوئی ہے:

بسم الرحمٰن الرحیم
کلما دخل علیها زکریا
} سفید تختہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
هٰذا مسجد الرضوان
مأثرة من مآثر جیب المنان
عمرة المنتقل الی رحمة الرحمان
المغفور لہ السلطان محمد..خان
۱۲۵۵ھ
} سیاہ تختہ

لقد رضی اللہ عن المؤمنین اذ یبایعونك
. . . . رمم ھذا المسجد سنة ۱۳۶۱ھ
} سفید تختہ

اس مسجد کی بائیں طرف وہ راستہ ہے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر مکہ معظمہ تشریف لائے تھے یہ راستہ وادی فاطمہ کو جاتا ہے، جو ایک نہایت سرسبز و شاداب وادی ہے جدہ شہر کو سارا پانی اسی وادی سے مہیا کیا جاتا ہے۔اس کا قدیم اور اصل نام مرالظہران ہے۔

اصل مسجد کے قریب لشکر کے لیے لوہے کے چھپروں کی ایک اور مسجد بنی ہوئی ہے ساتھ ہی ایک چاردیواری کے اندر شمیسی گاؤں کے لوگوں کا قبرستان ہے شمیسی اس گاؤں کا جدید نام ہے۔اس کا اصل اور قدیم نام حدیبیہ ہے، جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں۔

ہم نے مغرب کی نماز اسی مسجد میں ادا کی اور پھر مکہ معظمہ واپس آگئے۔

استاذ احمد علی و استاذ سعید العامودی رات کو عشا کے بعد استاذ احمد علی اور استاذ سعید العامودی مولانا سے ملاقات کے لیے تشریف لائے۔استاذ احمد علی مکہ معظمہ کے کلیۃ الشریعہ کے مدیر (پرنسپل) ہیں۔ادب اور تاریخ سے انہیں خاص دلچسپی ہے۔مکہ معظمہ کے "المنہل" (ماہنامہ) اور "الحج" (ماہنامہ) میں ان کے مضامین اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ان کے والد ہندوستان ہی کے رہنے والے تھے اور بعد میں مکہ معظمہ ہجرت کر گئے تھے۔استاذ احمد علی کی پیدائش مکہ معظمہ ہی میں ہوئی لیکن گھر کے ماحول کی وجہ سے اردو اچھی خاصی جانتے ہیں۔مولانا سے عربی اور اردو دونوں زبانوں میں گفتگو کرتے رہے۔ان دنوں "آل سعود" نامی ان کی ایک کتاب تازہ تازہ شائع ہوئی تھی، اس لیے انہوں نے اس کا ایک ایک نسخہ مولانا، چودھری صاحب اور مجھے بطور ہدیہ پیش فرمایا۔استاذ سعید العامودی "الحج" کے ایڈیٹر ہیں اور بہت ہی سنجیدہ اور سمجھدار آدمی ہیں۔ان کی ادارت سے پہلے "الحج" ایک معمولی پرچہ تھا، جس میں زیادہ تر مضامین حج ہی سے متعلق ہوا کرتے تھے یا پھر حکومت کے اعلانات شائع ہوتے تھے، لیکن اب یہ ایک اعلیٰ درجہ کا علمی پرچہ بن گیا ہے۔ان دونوں حضرات سے "دنیا میں دعوتِ اسلامی کی کامیابی کے امکانات" پر گفتگو رہی۔ہمارے پاس مولانا کی عربی کتابوں میں سے چند کتابیں تھیں، وہ ہم نے انہیں پیش کیں اور باقی بعد میں دمشق سے بھجوادیں۔

جدہ واپسی | ظہر کی نماز کے بعد ہم نے طوافِ وداع کیا پھر جدہ کے لیے روانہ ہوئے اور عصر کے قریب وہاں پہنچ گئے رات گئے تک مختلف پاکستانی اور عرب دوست ملاقات کے لیے آتے رہے۔ آنے والوں میں ایک صاحب شیخ احمد سلیمان العشماوی بھی تھے، جو شیخ مصطفیٰ عالم کی طرح دراصل مصری ہیں۔ ان کا تعلق بھی اخوان سے تھا، اس لیے جیل میں بھی رہے، لیکن جیل سے رہا ہوتے ہی حج کے لیے مکہ معظمہ چلے آئے اور اب انہوں نے جدہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی ہے۔

مصری سفارت خانہ | اگلے دن (۹ دسمبر) چودھری غلام محمد صاحب مصری سفارت خانے گئے۔ میری طبیعت جدہ پہنچتے ہی بہت خراب ہو گئی تھی، اس لیے میں بھی ان کے ساتھ نہ جا سکا۔ ہماری پہلی ملاقات کے بعد مصری سفیر نے ہمارے متعلق اپنی حکومت کو تار دیا تھا۔ وہاں سے ان کے نام وزارتِ مواصلات اور وزارتِ خارجہ کا مشترک تار آیا کہ وہ ہمارا خوش استقبال کریں گے اور جزیرہ نما سینا کے سفر میں ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچائیں گے اور یہ بھی لکھا کہ سفیر انہیں ہمارے پہنچنے کی اطلاع دیں۔

شیخ محمد نصیف کی دعوت | اگلے دن (۱۰ دسمبر) دوپہر کے وقت شیخ محمد نصیف کے ہاں مولانا کے اعزاز میں دعوت تھی۔ مولانا اور چودھری صاحب وہاں گئے۔ میں اپنی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے ان کے ساتھ نہ جا سکا۔ دعوت میں جن حضرات سے ملاقات ہوئی، ان میں مستشار السفیر المغربی (سفیر مراکش کے ایڈوائزر) بھی تھے۔ مغرب عربی (مراکش) کے لوگ وہاں کے ماہنامہ "دعوۃ الحق" میں مولانا کے مضامین کی وجہ سے مولانا سے اچھی طرح واقف ہیں، چنانچہ دعوۃ الحق کا ایک تازہ پرچہ جس میں مولانا کا ایک مضمون شائع ہوا تھا، مستشار صاحب نے مولانا کو دیا۔

جدہ ریڈیو کو انٹرویو | عصر کے قریب عبداللہ عباس ندوی (جو سعودی ریڈیو جدہ میں اردو پروگرام کے ذمہ دار ہیں)، ہماری جائے قیام پر آئے۔ انہوں نے مولانا سے اردو میں

چند سوالات کیے اور مولانا نے ان کے جوابات دیے۔ ان سوالات و جوابات کو مکالمہ کی شکل میں ٹیپ ریکارڈ کر لیا گیا، اور انہیں اگلے دن اردو میں اور اس سے اگلے دن عربی میں ریڈیو سے نشر کیا گیا۔[1]

جدہ کے اسلام پسند نوجوانوں کا اجتماع جدہ میں ایسے نوجوانوں کا اچھا خاصا حلقہ ہے جو حسن بنا شہیدؒ اور مولانا مودودی کی کتابیں پڑھے ہوئے اور ان سے متاثر ہیں۔ ان لوگوں نے مولانا کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دے رکھی تھی، چنانچہ عشا کے بعد مولانا ان کے ہاں گئے میری طبیعت ابھی تک خراب تھی۔ اتفاق سے چودھری صاحب کو بھی اس روز زکام ہو گیا، اس لیے ہم دونوں مولانا کے ساتھ نہ جا سکے۔ تقریباً تین گھنٹے کے بعد مولانا واپس تشریف لائے۔ وہاں کے متعلق دوسری باتوں کے علاوہ جو خاص بات مولانا نے بیان فرمائی وہ یہ تھی کہ اس اجتماع میں محکمہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب موجود تھے انہوں نے اپنے ملک میں عرب قومیت کے تعصب، مغربی تہذیب اور اخلاقی انحطاط کے دن بدن بڑھنے اور پھیلنے کی سخت شکایت کی مصر سے ایک ہفتہ وار پرچہ "المصوّر" شائع ہوتا ہے جس کے صرف دو مقصد ہیں۔ ایک عرب ملکوں میں اپنی حکومت کا پروپیگنڈا کرنا اور دوسرا، نوجوانوں میں فحش مضامین و برہنہ تصاویر کے ذریعے بے دینی اور بد اخلاقی پھیلانا۔ ان صاحب کے بیان کے مطابق صرف سعودی عرب کے اندر اس کے پچاس ہزار نسخے ہر ماہ درآمد ہوتے ہیں اور حالت یہ ہے کہ جب یہ کسی شہر میں پہنچتا ہے۔ تو ہاکر کی دکان پر نوجوان خریداروں کا تانتا بندھا ہوتا ہے بعض نوجوان تو اس کے لیے اس قدر بے تاب ہوتے ہیں کہ انہوں نے اس کی قیمت پیشگی ادا کی ہوتی ہے بلکہ ان کے نام سے ہاکر کی دکان میں پوسٹ بکس کی طرح بکس بنے ہوتے ہیں کہ جونہی یہ اور اس طرح کے بہت سے دوسرے گندے پرچے اس کے ہاں پہنچیں، ان کے لیے فوراً مخصوص کر دیئے جائیں۔ ان ہی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ عرب قومیت کی ستائش میں شاعر "القروی" کا مشہور قصیدہ پہلی بار اسی "المصوّر" میں شائع ہوا تھا۔ جس وقت یہ پرچہ سعودی عرب

[1] یہ سوالات و جوابات "چراغِ راہ" فروری ۱۹۶۰ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ جگہ کی کمی کے باعث ترجمان القرآن کی اس قسط میں نہیں دیئے جا رہے۔ ان شاء اللہ اس سفرنامہ کو کتابی شکل میں شائع کرتے وقت انہیں شامل کر دیا جائے گا۔ (م-ع)

میں پہنچا تو مفتی اکبر شیخ محمد بن ابراہیم کی طرف سے مراقبہ (سنسر) والوں کے نام حکم جاری ہوا کہ آئندہ سے سعودی عرب کے اندر اس پرچے کا داخلہ بند کر دیا جائے، مگر مراقبہ والوں نے یہ کہہ کر تعمیل حکم سے انکار کر دیا کہ جب تک مجلس الوزراء (کیبنٹ) کی طرف سے حکم نامہ نہیں آئے گا اس کا داخلہ بند نہیں کیا جا سکتا، مگر آج تک نہ حکم نامہ آیا اور نہ اس پرچے کا داخلہ بند ہوا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سعودی عرب میں قدیم اور جدید یا دوسرے الفاظ میں دینی و غیر دینی رجحانات رکھنے والوں کے درمیان کشمکش اندر ہی اندر کس زور سے چل رہی ہے۔

اگلے دن (۱۱ر دسمبر) جمعہ تھا۔ جمعہ کی نماز ہم نے جدہ کی سب سے بڑی مسجد باحفوظ میں پڑھی، جس کے خطیب ایک سوڈانی عالم شیخ محجوب ہیں۔ شیخ احمد سلیمان العشماوی بھی موجود تھے۔ خطبہ کے بعد انہوں نے لوگوں کو مولانا کی تقریر سننے کے لیے بٹھا لیا اور مولانا کا تعارف کرایا۔ مولانا نے معذرت کرنا چاہی، مگر چند منٹ تک عربی میں برجستہ بولنا ہی پڑا۔ عرب حضرات بولنے کے بڑے دھنی ہیں، آپ جب چاہیں، جس عرب کو پکڑ کر کھڑا کر دیں، وہ تقریر کر ڈالے گا۔ مولانا کے بعد شیخ احمد سلیمان العشماوی اور شیخ مصطفیٰ عالم وغیرہ نے تقریریں کیں۔ مسجد سے ہم شیخ احمد سلیمان العشماوی کے ہاں گئے اور وہاں دوپہر کا کھانا کھایا۔ کھانے پر عدن کے ایک دوست عمر طرموم سے ملاقات ہوئی، جو دو روز پہلے اپنے ایک ذاتی کام کے سلسلے میں جدہ آئے تھے۔ عدن میں جو لوگ وہاں کے مشہور عالم شیخ سالم البیحانی کی نگرانی اور تربیت میں دعوتِ اسلامی کا کام کرتے ہیں، عمر طرموم ان میں سے ایک ہیں۔ ان سے مل کر عدن کے حالات معلوم ہوتے۔

جدہ میں "انجمن خدامِ حجاج" کے نام سے ایک انجمن قائم ہے جس کے تمام کارکن ہندوستان یا پاکستان کے باشندے ہیں۔ ان لوگوں نے مولانا سے تقریر کی درخواست کی، جسے مولانا نے منظور کر لیا۔ چنانچہ اسی روز مغرب کے بعد یہ تقریر ہوئی۔ پہلے انجمن کے صدر جناب اے جی نہاں صاحب (عبدالغفار خاں صاحب) نے استقبالیہ تقریر کی۔ پھر تقریباً ایک گھنٹہ تک مولانا

نے تقریر کی۔ تقریر کا موضوع حالات کی مناسبت سے "سعودی عرب میں اسلام کے لیے کام کرنے والوں کی ذمہ داریاں" تھا۔ ساری تقریر ٹیپ ریکارڈ کی گئی۔ ڈیڑھ دو سو کے قریب حضرات کی حاضری تھی۔ بعد میں سوالات کا سلسلہ بھی ہوا۔[1]

عرب قومیت اور پاکستان اگلے دن (۱۲ دسمبر) کوئی خاص پروگرام نہیں رہا۔ صرف مختلف احباب سے ملاقاتیں رہیں۔ ملاقات کے لیے آنے والوں میں پاکستانی بھی تھے اور عرب بھی۔ عرب نوجوانوں سے دوسرے مسائل کے علاوہ عرب قومیت کے موضوع پر خاص طور پر گفتگو رہتی تھی۔

استاذ محمد احمد باشمیل مکہ معظمہ کے ایک خالص اسلامی طرزِ فکر رکھنے والے ادیب ہیں حال ہی میں ان کی ایک کتاب "القومیۃ فی نظر الاسلام" شائع ہوئی ہے جس میں انہوں نے خالص اسلامی نقطۂ نظر سے عرب قومیت کی خوب خوب خبر لی ہے اور اس کے نقصانات اور خطرناک نتائج سے عرب نوجوانوں کو خبردار کیا ہے۔ سنا ہے کہ اس کتاب نے شائع ہوتے ہی پورے سعودی عرب میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں بہت سے نوجوان عرب قومیت سے تائب ہو رہے ہیں۔ اس وقت تک اس کے پانچ ہزار نسخے نکل چکے ہیں اور اب مصنف نے دس ہزار اور چھپوائی ہے اس کتاب میں محمد احمد باشمیل نے مولانا کا نام لیے بغیر وہ بحث نقل کی ہے، جو ان سے اور عرب

---

[1] یہی وہ تقریر تھی جس کا میں نے نومبر کی قسط میں قارئین سے وعدہ کیا تھا۔ اس تقریر کا ٹیپ ریکارڈ کراچی پہنچ گیا تھا، اس لیے خیال تھا کہ اسے نقل کر کے اس مہینے کی قسط میں شائع کر دیا جائے گا، مگر آخر وقت میں معلوم ہوا کہ جو ٹیپ ریکارڈ کراچی پہنچا ہے وہ ناقص ہے اور اس سے تقریر کا نقل کرنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ اب اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ ہم جدہ کے احباب سے دریافت کریں کہ آیا ان کے پاس تقریر کا کوئی صاف ٹیپ ریکارڈ ہے کہ نہیں؟ اور اگر ہو تو ان سے درخواست کریں کہ وہ اسے نقل کر کے ہمیں بھیج دیں۔ اگر اس سکیم کے مطابق تقریر کی نقل ہمیں مل گئی تو اسے ان شاء اللہ اس سفرنامہ کو کتابی شکل میں شائع کرنے وقت شامل کر دیا جائے گا۔ امید ہے اس کوتاہی پر قارئین ہمیں معاف فرمائیں گے۔ (م۔ع)

قومیت سے متاثر ایک نوجوان کے درمیان ہوئی۔ اس نوجوان نے مولانا سے سوال کیا کہ آپ پاکستانی حضرات نے عربوں کے قومی معاملات میں کیا کیا ہے؟ مولانا نے اس سوال کا جواب یہ دیا کہ "ہم نے اپنے عرب بھائیوں کے مسائل میں ہمیشہ ان کی تائید کی ہے اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے، لیکن اس تائید کی بنیاد آپ لوگوں کا یہ نعرہ نہیں ہے جسے آپ عرب قومیت، عرب قومیت کے نام سے لگا رہے ہیں، بلکہ اس کی بنیاد وہ دینی رابطہ ہے جو ہمارے اور آپ کے درمیان اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے۔ آپ حضرات اس دینی رابطہ کو ختم کرنے کے درپے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم اب تک اس کی پاسداری کر رہے ہیں اور ان شاء اللہ آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔ جب سے پاکستان معرضِ وجود میں آیا ہے، اس نے نہ صرف فلسطین اور الجزائر بلکہ عربوں کے تمام دوسرے مسائل میں ان کی پوری تائید کی ہے۔ لیکن آپ حضرات کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہر قوم جو ایک خاص ملک میں رہتی ہے، اس کے کچھ اپنے مسائل بھی ہوتے ہیں، جن سے اسے بہر حال نپٹنا ہوتا ہے۔ اگر آپ لوگوں کو فلسطین اور الجزائر یا دوسرے مسائل درپیش ہیں تو ہم پاکستانیوں کے لیے بھی کشمیر کا مسئلہ درپیش ہے۔ اگر یہودیوں نے آپ کے دس لاکھ افراد کو قتل اور جلاوطن کیا ہے تو ہندوؤں نے ہمارے ایک کروڑ کے قریب افراد کو قتل اور جلاوطن کیا ہے اور اب تک ہندوستان اور کشمیر میں ان کے ظلم وستم کا سلسلہ جاری ہے۔ آپ لوگ اپنی یادداشت پر زور ڈال کر ذرا مجھے بتائیے کہ اس پورے المیہ میں آپ لوگوں نے ہماری کہاں تک تائید کی ہے؟ مجھے یقین ہے کہ آپ لوگ اس کا کوئی جواب نہ دے سکیں گے۔ لہٰذا میں خود ہی اس کا جواب دیتا ہوں۔ آپ لوگوں نے ہماری مدد یوں کی ہے کہ جب ہندوستان و کشمیر میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی تو آپ لوگوں نے اپنی زبانوں پر قفل چڑھا لیے۔ آپ کے اخبارات نے اس کی مذمت میں چند سطروں تک کے لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کے مقابلے میں پاکستان کے تمام اخبارات نے آپ لوگوں پر کسی طرف سے جو بھی زیادتی ہوئی، اس کی ہمیشہ مذمت کی ہے اور اب تک کر رہے ہیں۔ کاش آپ لوگوں کی کرم فرمائی

یہیں تک محدود رہ جاتی، مگر آپ نے اثباتی غیر جانبداری اور امن و سلامتی کے علمبردار (ابطال الحیاد الایجابی ورسل السلام) کا لقب دیتے ہوتے ان لوگوں کی طرف دوستی و محبت کا ہاتھ بڑھایا جن کے ہاتھ اب تک مسلمانوں کے خون سے رنگے ہوتے ہیں۔ کاش ہندوستان کو آپ لوگوں کی دوستی کا واقعی پاس ہوتا، مگر اس نے آپ کو کوئی وقعت نہ دیتے ہوئے اسرائیل کو تسلیم کیا اور اب تک اسے تسلیم کیے ہوتے ہے۔ اس کے مقابلے میں پاکستان نے اب تک نہ اسرائیل کو تسلیم کیا ہے اور نہ کبھی اسرائیل کے کسی باشندے کو اپنی سرزمین میں قدم رکھنے کی اجازت دی ہے۔ سوچیے! اگر خدانخواستہ آپ لوگوں کی ضد میں آکر ہم لوگ بھی اسرائیل کو تسلیم کرلیں اور اس کے ساتھ دوستی و محبت کے روابط پیدا کرنے لگیں، اور بن گوریون کو اپنے ملک میں آنے کی دعوت دیں اور اس کے لیے رسول السلام کے نعرے لگا کر اس کا استقبال کریں، تو کیا اس صورت میں آپ لوگ ہمیں کچھ بھی ملامت کرنے کا حق رکھتے ہیں؟ لیکن نہیں، ہرگز نہیں، میں تو اسے آپ لوگوں کے سامنے ایک مفروضہ کے طور پر بیان کر رہا ہوں۔ ورنہ ہم پاکستانی مسلمان اس کا خیال تک دل میں نہیں لاسکتے، اس لیے کہ ہمارا دین ہمیں اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا لہٰذا مجھے امید ہے کہ اس مفروضہ کے ذکر سے میں نے آپ لوگوں کی دل آزاری نہیں کی ہوگی"

باشمیل صاحب نے اس ساری گفتگو کو نقل کرنے کے بعد تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب میں کشمیر کے مسئلے اور ہندوستانی مسلمانوں کے مصائب کا ذکر کیا ہے اور عرب سیاست دانوں کو شرم دلائی ہے کہ انہوں نے آج تک کبھی ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں کے لیے کچھ نہیں کیا۔

جدہ سے مدینہ منورہ ۱۲ دسمبر کی صبح ۸½ بجے ہم جدہ سے مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوئے۔ اگرچہ ہم تین آدمی تھے، لیکن سامان زیادہ ہونے کی وجہ سے ہمیں سات سیٹوں والی ٹیکسی لینی پڑی، جس کا ہم نے ۱۲۵ ریال کرایہ ادا کیا۔

جدہ سے مدینہ منورہ کے درمیان ۴۲۵ کیلومیٹر (۲۶۵ میل) کا فاصلہ ہے۔ سڑک نئی بنی ہوئی ہے اور نہایت عمدہ ہے اور اس کی حفاظت اور مرمت کا بھی پورا پورا اہتمام کیا جاتا ہے

سب سے پہلی بستی جو ہمارے راستے میں آئی، وہ دُھبان تھی۔ اس کے بعد ثَوَل اور قضیمہ کی بستیاں آئیں۔ موٹروں سے پہلے جب لوگ پیدل یا اونٹوں پر سفر کیا کرتے تھے تو مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ جانے والے مسافر جدہ نہیں آیا کرتے تھے، بلکہ قضیمہ پہنچ کر مشرق کی طرف مڑ جاتے تھے اور پھر عُسفان اور شُمَیسی (حدیبیہ) یا عُسفان اور وادیٔ فاطمہ (مرالظہران) کے راستے سے مکہ معظمہ پہنچتے تھے۔ ممکن ہے اونٹوں پر سفر کرنے والے مسافر اب بھی اس راستہ سے آتے جاتے ہوں، لیکن موٹریں اس راستہ پر نہیں چلتیں۔ اس کے بعد ہم رابغ پہنچے، جو بحرِ قلزم پر ایک چھوٹی سی بندرگاہ ہے اور مصر و شام کی طرف سے آنے والے حاجی یہیں سے حج یا عمرہ کا احرام باندھتے ہیں۔ ۱۶ کیلو میٹر اور چلنے کے بعد ہم مستُورہ پہنچے۔ مستورہ تک — جو جدہ سے ۱۷ کیلو میٹر ہے۔ گویا ہم بحرِ قلزم کے ساتھ ساتھ سفر کرتے رہے، لیکن اس کے بعد سڑک دائیں طرف یعنی مشرق کو مڑ گئی۔ تقریباً ۸۰ کیلو میٹر اور چلنے کے بعد ہم مفرق پہنچے۔ یہاں سے ایک سڑک مدینہ منورہ کو جاتی ہے اور دوسری ینبُع کو، جو بحرِ قلزم پر ایک بندرگاہ ہے اور یہیں مصر و شام کے وہ حاجی آکر اترتے ہیں، جو حج سے پہلے مدینہ منورہ آنا چاہتے ہیں۔ مفرق کا فاصلہ مدینہ سے ۱۵۵ کیلو میٹر اور جدہ سے ۲۶۹ کیلو میٹر ہے۔ جدہ سے آتے ہوتے یہاں سے پہاڑی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ۷ کیلو میٹر اور چلنے کے بعد ہم ۱۱½ بجے کے قریب بدر پہنچ گئے۔

بدر: ہم نے بدر میں تین گھنٹے قیام کیا۔ اس اثنا میں ایک مقامی آدمی کو ساتھ لیکر ہم وہ مقام بھی دیکھنے گئے، جہاں معرکۂ بدر پیش آیا تھا۔ یہ مقام بدر کی بستی سے دو کیلو میٹر (۱¼ میل) پر مغرب کی طرف واقع ہے، وہاں ایک چھوٹے سے احاطہ میں ۱۳ شہدائے بدر مدفون ہیں، اور قریب ہی اہلِ بدر کا موجودہ قبرستان بھی ہے۔ اس جگہ پہنچنے کے لیے مدینہ منورہ کی طرف سے آنے والے کو دائیں جانب اور جدہ کی طرف سے آنے والے کو بائیں طرف مڑنا ہوتا ہے۔

یہ مقام یعنی بدر مفرق سے ۷ کیلو میٹر ہے، جہاں سے ینبع سے آنے والی سڑک مدینہ سے آنے والی سڑک سے مل جاتی ہے۔ کفار کا قافلہ جو شام سے آرہا تھا، وہ اس سڑک سے

مکہ کی طرف چلا گیا اور کفار کا لشکر آگے بڑھ کر بدر کے مقام پر اس لیے ٹھہر گیا کہ مسلمانوں کا راستہ روک سکے۔ شہداء کی قبریں جس جگہ واقع ہیں، وہاں اب کوئی نشان نہیں ہے، صرف ایک حوض ہے جس کے چاروں طرف منڈیر بنی ہوئی ہے۔ جو مقامی آدمی ہمارے ساتھ تھا اس کی مدد سے ہم نے العدوۃ القصویٰ، العدوۃ الدنیا اور کفار اور صحابہ کرامؓ کے آنے کی سمتوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔

ظہر کی نماز پڑھ کر ۲½ بجے کے قریب ہم بدر سے روانہ ہوئے اور الواسطہ، الحمراء، مسیجید اور بئر علی ہوتے ہوئے عصر اور مغرب کے درمیان مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ بئر علی (جو مدینہ منورہ سے صرف پانچ میل ہے) کا قدیم نام ذوالحلیفہ ہے اور یہی وہ جگہ ہے جہاں سے حجۃ الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے حج کا احرام باندھا تھا۔ اہل مدینہ کا اب بھی یہی میقات ہے۔ راستے میں ہمیں بہت سی ایسی بستیاں بھی نظر آئیں، جن میں کچے مکان اور کھجور کے اُجڑے ہوئے باغ تو موجود تھے، لیکن آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ عرب کی آبادی کس تیز رفتاری سے گاؤں چھوڑ چھوڑ کر شہروں میں منتقل ہو رہی ہے اور کس طرح پٹرول کی وجہ سے ملک کی زراعت دن بدن تباہ ہوتی جا رہی ہے۔

مدینہ وصولی مدینہ منورہ میں ہم نے فندق قصر المدینہ (مدینہ پیلس ہوٹل) میں قیام کیا جو مسجد نبوی سے متصل صاف ستھرا ہوٹل ہے۔ مغرب کی نماز ہم نے حرم میں ادا کی اور پھر سلام کے لیے حاضری دی۔ عشاء کی نماز کے بعد مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی کی دعوت پر ان کے ہاں کھانے پر گئے۔ مولانا بدر عالم صاحب کو چند ماہ پہلے موٹر کا ایک سخت حادثہ پیش آ گیا تھا، جس کی وجہ سے ان کی ایک انگلی بھی کٹ گئی تھی اور ایک بازو بھی پوری طرح کام نہ کر رہا تھا۔ اللہ کرے اب وہ پوری طرح صحت یاب ہو چکے ہوں۔

مسجد نبوی اب کی مرتبہ مدینہ منورہ ہمیں نہایت کھلا اور صاف ستھرا شہر نظر آیا۔ ۱۹۵۶ء

میں حج کے بعد جب ہم یہاں آئے تھے، تو مسجد نبوی کی توسیع و تعمیر اور اس کے اردگرد مکانات کو گرا کر نئی سڑکیں اور راستے بنانے کا سلسلہ جاری تھا۔ اب یہ سارا کام مکمل ہو چکا تھا۔ نئی توسیع و تعمیر کے بعد مسجد نبوی نہایت خوبصورت و شاندار بھی ہو چکی ہے اور اس کا رقبہ بھی پہلے کی نسبت ڈیوڑھا بلکہ ڈیوڑھے سے بھی زیادہ ہو چکا ہے۔ اس کے اردگرد ہر طرف کافی کھلا اور پختہ راستہ چھوڑا گیا ہے تاکہ مسجد میں آنے اور اس سے نکلنے والوں کو تکلیف نہ ہو۔ موٹروں کے آنے اور ٹھہرنے کے لیے پیچھے یعنی شمال کی جانب کھلا میدان رکھا گیا ہے، اس طرح موٹروں کے شور کا بھی مسجد میں نماز پڑھنے اور تلاوت کرنے والوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مدینہ منورہ میں تین چار ہوٹل ہیں، جو سب کے سب نئے اور مسجد کے قریب ہی بنے ہوئے ہیں۔ مکہ معظمہ کے ہوٹل حرم سے کافی فاصلہ پر ہیں۔

مدینہ منورہ کا موسم | مدینہ منورہ میں جدہ اور مکہ معظمہ کی نسبت کافی سردی تھی لیکن ہمارے ہاں لاہور کے برابر نہ تھی۔ تاہم رات کو وضو کے لیے ہمیں گرم پانی استعمال کرنا اور کمرے کے دروازے بند کر کے سونا پڑتا تھا۔

امیر مدینہ سے ملاقات | اگلے دن (۴ دسمبر) صبح کے وقت میں اور چودھری صاحب مدینہ منورہ کے گورنر (امیر المدینہ) کے دفتر گئے۔ مدینہ کے گورنر ضابطہ کے لحاظ سے شاہی خاندان کے ایک شہزادہ ہیں، لیکن وہ عملاً سارا سال نجد میں رہتے ہیں۔ ان کے وکیل (سکرٹری)، عبداللہ السُدَیری ان کی جگہ تمام فرائض انجام دیتے ہیں، اس لیے عموماً ان ہی کو امیر المدینہ کہا جاتا ہے۔ سُدَیری نجد کا ایک بہت ہی بارسوخ خاندان ہے۔ سعودی خاندان کی اس سے رشتہ داریاں بھی ہیں، اس لیے اس کے بہت سے افراد کئی جگہوں مثلاً تبوک، وجہ اور حائل کے امیر یا وکیل الامیر ہیں۔ مدینہ میں جس عمارت میں امیر کا دفتر ہے وہ بہت ہی خستہ اور پرانے طرز کی عمارت ہے۔ اس کی اب تک قسمت نہ جاگنے پر ہمیں بڑا تعجب ہوا۔ امیر عبداللہ السدیری سے ہماری ملاقات نہ ہو سکی۔ ان کے وکیل۔ جو

ان کے بڑے صاحبزادے ہیں ___ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مغرب کے بعد مولانا کو اپنے والد کے ہاں آنے کی دعوت دی۔ مغرب کے بعد ہم ان کے ہاں گئے۔ بہت ہی سادہ لیکن باخبر قسم کے آدمی معلوم ہوتے۔ اسلامی آثار کی حفاظت سے غفلت پر افسوس ظاہر کرتے رہے اور اس کے مقابلے میں یورپ اور امریکہ والے جس طرح اپنے آثار کی حفاظت کرتے ہیں اس پر رشک کرتے رہے۔ انہوں نے ہمیں آئندہ سفر کے سلسلے میں ہر قسم کی سہولت پہنچانے کا یقین دلایا۔ ہمیں اور کسی قسم کی مدد کی ضرورت نہ تھی، البتہ ہمارا آئندہ سفر چونکہ ایک ایسے علاقے میں ہونا تھا، جس سے ہم بالکل ناواقف تھے اور جس میں ذرائع آمد ورفت کا انتظام بطور خود کرنا ناممکن تھا، اس لیے ہم نے ان سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ کسی موٹر والے سے ہمارا معاملہ طے کرا دیں جو بحساب فی یوم ہم سے اپنی موٹر کا کرایہ وصول کرے اور ہمارے ساتھ اس وقت تک رہے جب تک ہم سعودی مملکت سے نکل کر اردن میں داخل نہ ہو جائیں۔ امیر نے نہ صرف پولیس انسپکٹر کے ذریعے ایسا ڈرائیور تلاش کرنے کا وعدہ کیا بلکہ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ میں آپ لوگوں کے ساتھ اپنا ایک آدمی بھی دوں گا جو اس وقت تک آپ کی حفاظت اور رہنمائی کے لیے ساتھ رہے گا جب تک آپ اردن میں داخل نہیں ہو جائیں گے اس پر ہم نے امیر کا شکریہ ادا کیا۔

ملاقاتیں عصر کے بعد محمد زین الشنقیطی اور ان کے دوست حبیب الرحمٰن الباکستانی سے ملاقات ہوئی محمد زین صاحب ایک ذی علم اور گہرا اسلامی جذبہ رکھنے والے نوجوان ہیں۔ یہ اصل میں شنقیط[1] کے رہنے والے ہیں، لیکن تعلیم کی غرض سے گزشتہ پندرہ سال سے مدینہ منورہ میں مقیم ہیں اور اب سعودی ہو چکے ہیں۔ اس وقت مدینہ منورہ کے سرکاری یتیم خانے ___ دار الایتام والصنائع ___ میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ان سے ہمارا تعارف

---

[1] شنقیط مراکش کی اس ریاست کا نام ہے جسے حال میں فرانس نے موریٹانیہ کے نام سے مراکش سے الگ ایک مستقل ریاست بنا دیا ہے۔

پہلی مرتبہ ۱۹۴۹ء میں ہوا، جبکہ انہوں نے مولانا مودودی کی چند کتابیں پڑھنے کے بعد اپنے آپ کو جماعت اسلامی کی رکنیت کے لیے پیش کیا تھا، لیکن پاکستان سے باہر کسی کو رکن بنانا چونکہ جماعت کی پالیسی نہیں تھی اس لیے یہ جماعت کے رکن تو نہ ہو سکے، لیکن ان سے تعلقات اور مراسلت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔ مدینہ منورہ میں جن لوگوں نے مولانا کی کتابیں پڑھی ہیں انہیں ان کتابوں سے روشناس کرانے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ ان کے ساتھی حبیب الرحمٰن صاحب دراصل بلوچستان کے رہنے والے ہیں، لیکن کئی سال سے مدینہ منورہ ہی میں مقیم ہیں اور اب سعودی ہو چکے ہیں۔ یہ بھی محمد زین صاحب کے ساتھ دار الایتام میں مدرس ہیں۔

اس روز جن دوسرے حضرات سے ملاقات ہوئی، ان میں ایک ترکستانی عالم شیخ قاسم اندجانی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ ترکستانی مہاجر ہیں۔ ہجرت کر کے پہلے ہندوستان آئے لیکن بعد میں مستقل طور پر مدینہ منورہ چلے آئے اور اب دار الایتام ہی میں مدرس ہیں۔ ترکستان کے حالات پر انہوں نے عربی اور ترکستانی زبان میں بعض کتابیں بھی لکھی ہیں، لیکن حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے اب تک شائع نہیں ہو سکیں۔

اسی روز حرم میں عراق کے مشہور عالم شیخ امجد الزہاوی سے بھی ملاقات ہوئی۔ عراق کی حالت اور اس میں کمیونسٹوں کے ظلم و تشدد اور خرمستیوں کا ذکر کرتے رہے۔ ان کے اندازِ گفتگو سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ عراق کے حالات کا ان کے ذہن پر سخت بُرا اثر پڑا ہے۔ عراق سے حج کے ارادے سے حجاز تو آ گئے تھے، لیکن واپس جانا نہیں چاہتے تھے۔ ہم نے جہاں تک ہو سکا انہیں صبر و تحمل کے ساتھ حالات کا انتظار کرنے کی تلقین کی۔

(باقی)

اعتذار

ترجمان القرآن (جنوری ۱۹۶۱ء) کے شمارہ میں صفحات ۲۲۴-۲۲۵ کی ترتیب غلطی سے آگے پیچھے ہو گئی ہے۔ اس کے لیے ادارہ قارئین سے معذرت خواہ ہے

(منیجر)